۱

برسات کے دن ہیں، ساون کا مہینہ۔ آسمان پر سنہری گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ رہ رہ کر رم جھم بارش ہونے لگتی ہے۔ ابھی تیسرا ہی پہر ہے پر ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا شام ہو گئی۔ آموں کے باغ میں جھولا پڑا ہوا ہے لڑکیاں بھی جھول رہی ہیں اور ان کی مائیں بھی، دو چار جھول رہی ہیں دو چار جھولنے کے انتظار میں کھڑی ہیں۔ کوئی کجلی گانے لگتی ہے کوئی بارہ ماسہ، یہ موسم دیویوں کے دل میں بچپن کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ یہ پھواریں گویا فکروں کو دل سے دھو ڈالتی ہیں۔ سبھی کے دل امنگوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ دھانی ساڑیاں قدرت کی ہریالی سے رنگ ہو رہی ہیں۔

اسی وقت ایک بساطی آکر جھولے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی جھولا بند ہو گیا۔ چھوٹی بڑی سبھوں نے آکر اسے گھیر لیا۔ بساطی نے اپنا صندوق کھولا اور چمکتی دمکتی چیزیں نکال کر دکھانے لگا کچے موتی کے گہنے تھے کچے لیس اور گوٹے، رنگین موزے خوبصورت گھڑیاں۔ بچوں کے لٹو اور جھنجھنے، طرح طرح کے بگل اور سیٹیاں، سبھی نے اپنی اپنی پسند کی چیزیں چھانٹنی شروع کیں۔ ایک بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی نے وہ چیز پسند کی، جو ان چمکتی ہوئی چیزوں میں سب سے زیادہ خوشنما تھی۔ وہ فیروزہ رنگ کا ایک چندن ہار تھا۔

ماں نے بساطی سے پوچھا۔ یہ ہار کتنے کا ہے ؟

بساطی نے ہار کو پونچھتے ہوئے کہا۔ خرید تو بیس آنے کی ہے آپ جو چاہیں دے دیں۔

ماں نے کہا۔ یہ تو بڑا مہنگا ہے۔ چار دن میں اس کی یہ چمک دمک جاتی رہے گی۔

بساطی نے پُرمعنی انداز سے سر ہلا کر کہا۔ ہو جی۔ چار دن میں تو بٹیا کو اصلی چندن ہار مل جائے گا۔

ماں کے دل پر ان ہمدردانہ الفاظ نے چوٹ کی۔ ہار خرید لیا گیا۔

اس بھولی بھالی لڑکی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ شاید ہیروں کے ہار سے بھی اُسے اتنی خوشی نہ ہوتی۔ اُسے پہن کر وہ سارے گاؤں میں ناچتی پھری۔ اس کی ملکیت میں جو چیز سب سے قیمتی اور سب سے عزیز تھی وہ یہی بلّور کا ہار تھا۔

لڑکی کا نام جالپا تھا۔ ماں کا مانکی۔

(۲)

منشی دین دیال الٰہ آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ کسان نہ تھے مگر کھیتی کرتے تھے۔ زمیندار نہ تھے۔ مگر زمینداری کرتے تھے۔ تھانیدار نہ تھے مگر تھانیداری کرتے تھے۔ وہ زمیندار کے مختار تھے۔ گاؤں میں ان کی دھاک تھی۔ ان کے پاس چار چپڑاسی تھے۔ ایک گھوڑا۔ کئی گائیں اور بھینسیں۔ تنخواہ کل پانچ روپے تھی جو ان کے تمباکو کے خرچ کو بھی کافی نہ ہوتی تھی۔ مگر اس میں کچھ ایسی برکت تھی کہ رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ جالپا انہیں کی لڑکی تھی پہلے اس کے تین بھائی اور تھے۔ مگر اس وقت وہ اکیلی تھی۔ اس سے کوئی پوچھتا تیرے بھائی کیا ہوئے؟ تو وہ بڑی سادگی سے کہتی۔ بڑی دُور کھیلنے گئے ہیں۔ کہتے ہیں مختار صاحب نے ایک غریب کسان کو اتنا پٹوایا

تھا کہ وہ ایک ہفتہ کے اندر مر گیا اور سال کے اندر منشی جی کے تینوں لڑکے جاتے رہے۔ تب بیچارے بہت سنبھل کر چلتے تھے۔ اب یہی لڑکی ماں باپ کی زندگی کا سہارا تھی۔

منشی جی جب کبھی باہر جاتے تو جالپا کے لئے کوئی نہ کوئی زیور ضرور لاتے تھے۔ ان کے پختہ کار ذہن میں یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ جالپا کسی اور چیز سے زیادہ خوش ہو سکتی ہے۔ گڑیاں اور کھلونے ان کی نظروں میں بیکار تھے۔ اس لئے جالپا زیوروں ہی سے کھیلتی تھی۔ یہی اس کے کھلونے تھے۔ وہ بلور کا ہار جو اس نے بسا طی سے لیا تھا اب اس کا سب سے پیارا کھلونا تھا۔ اصلی ہار کی تمنا اس کے دل میں طلوع نہ ہوئی تھی۔ گاؤں میں کوئی تقریب ہوتی یا کوئی تیوہار آتا تو وہ وہی ہار پہنتی۔ کوئی دوسرا گہنا اس کی آنکھوں میں جچتا ہی نہ تھا۔

ایک دن منشی جی نوٹے تو مانکی کے لئے ایک چندن ہار لائے۔ مانکی کو یہ ارمان بہت دنوں سے تھا۔ جالپا کو اپنا ہار پھیکا معلوم ہونے لگا۔ باپ سے بولی۔ مجھے بھی ایسا ہی ہار لا دیجئے۔

منشی جی نے مسکرا کر کہا۔ لا دونگا بیٹی!

"کب لا دیجئے گا؟"

"بہت جلد"

باپ کی باتوں سے جالپا کا من نہ بھرا۔ اس نے ماں سے جا کر کہا۔ "مجھے بھی ایسا ہی ہار بنوا دو۔"

"اس میں تو بہت روپے لگیں گے۔"

"تم نے اپنے لئے بنوایا ہے تو میرے لئے کیوں نہیں بنواتیں؟"

"تیرے لئے سسرال سے آئے گا۔"

جالپا شرما کر بھاگ گئی۔ پر یہ الفاظ اس کے دل میں پتھر کی لکیر ہو گئے۔ سسرال اب اس کے لئے اتنی خوفناک چیز نہ تھی۔ سسرال سے چندن ہار آئے گا۔ شاید وہ لوگ

اسے ماں باپ سے زیادہ پیار کریں گے۔

اس طرح ہنستے کھیلتے سات سال گزر گئے۔

(۳)

منشی دین دیال کے شناساؤں میں ایک بابو دیا ناتھ تھا۔ بہت ہی وضعدار اور خلیق کچہری میں پچاس روپے کے نوکر تھے۔ دین دیال عدالت کے کیڑے تھے۔ آئے دن دیا ناتھ سے سابقہ پڑتا رہتا۔ چاہتے تو دین دیال سے ہزاروں وصول کرتے پر کبھی ایک پیسے کے بھی روادار نہ ہوئے تھے اور ان کا یہ برتاؤ کچھ دین دیال ہی کے ساتھ نہ تھا۔ یہ ان کی عادت تھی۔ یہ بات بھی نہ تھی کہ بڑے پرہیزگار ہوں۔ مگر رشوت کو حرام سمجھتے تھے۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس کے نتائج دیکھ چکے تھے۔ کسی کو جیل جاتے دیکھا تھا۔ کسی کو اولاد سے ہاتھ دھوتے دیکھا تھا۔ کسی کو مکروہات میں پھنستے۔ ایسی انہیں کوئی مثال نہ ملتی تھی جس نے رشوت لے کر چین کیا ہو۔ ان کے دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ حرام کی کمائی حرام ہی میں جاتی ہے۔

اس زمانے میں پچاس روپے کی بھگت ہی کیا؟ پانچ آدمیوں کی پرورش بڑی مشکل سے ہوتی تھی۔ لڑکے اچھے اچھے کپڑوں کو ترستے۔ بیوی گہنوں کو ترستی۔ مگر دیا ناتھ نیت کو برگشتہ نہ ہونے دیتے۔ بڑا لڑکا دو ہی مہینے کالج میں رہنے کے بعد پڑھنا چھوڑ بیٹھا۔ بابو صاحب نے صاف کہہ دیا۔ میں تمہاری ڈگری کے لئے سارے گھر کو بھوکا اور ننگا نہیں رکھ سکتا۔ پڑھنا چاہتے ہو تو اپنی قوت بازو سے پڑھو۔ لیکن رما ناتھ میں اتنا استقلال نہ تھا۔ ادھر دو سال سے وہ بالکل بیکار تھا۔ شطرنج کھیلتا۔ سیر سپاٹے کرتا۔ ماں باپ اور چھوٹے بھائیوں پر رعب جماتا۔ دوستوں کی بدولت امارت کے شوق پورے ہوتے رہتے تھے۔ کسی کا چیسٹر مانگ لیا اور شام کو ہوا کھانے نکل گئے۔ کسی کا پمپ شو پہن لیا۔ کسی کی گھڑی کلائی پر باندھ لی۔ کبھی بنارسی فیشن میں نکلے۔ کبھی لکھنوی فیشن میں۔ دس دوستوں نے ایک ایک سوٹ بنوا لیا

تو دس سوٹ بدلنے کے سامان ہو گئے ۔ باہمی امداد کا یہ نیا استعمال تھا۔ اسی نوجوان کو نشی دین دیال نے جاکیا کے لئے انتخاب کیا ۔ دیا ناتھ لڑکے کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ ان کے پاس روپے نہ تھے اور نہ نئے خاندان کے بوجھ اٹھانے کی ہمت ۔ مگر باگیشری کی ترپاہٹ کے سامنے ان کی ایک بھی پیش نہ گئی ۔ باگیشری برسوں سے بہو کے لئے تڑپ رہی تھی جو اس کے سامنے بہویں بن کر آئیں وہ آج پوتے کھلا رہی ہیں ۔ پھر اس غریب کو کیسے صبر ہوتا۔ وہ کچھ کچھ مایوس ہو چلی تھی ۔ ایشور سے منانی تھی کہ کہیں سے پیغام آئے ۔ دین دیال نے پیغام بھیجا تو اس کو آنکھیں سی مل گئیں ۔ اگر کہیں یہ شکار ہاتھ سے نکل گیا تو پھر نہ جانے اور کتنے دن راہ دیکھنی پڑے گی ۔ کوئی یہاں کیوں آنے لگا ؟ گھر میں نہ دولت ہے نہ اثاثہ ۔ اس لئے اس نے اس موقع پر سارا زور لگا دیا ۔ اور بالآخر اس کی فتح ہوئی ۔

دیا ناتھ نے کہا ۔ بھئی تم جانو ۔ تمہارا کام جانے ۔ مجھ میں اتنی مقدرت نہیں ہے ۔ جو آدمی اپنے پیٹ کی فکر نہیں کر سکتا ۔ اس کی شادی کرنا مجھے تو گناہ معلوم ہوتا ہے ۔ علاوہ بریں نقد روپے بھی چاہئیں ۔ ایک ہزار سے کم تو نمائش میں نہ صرف ہونگے ۔ جوڑے اور زیورات کے لئے الگ ۔ دکانوں پر ہاتھ پھیلا کر (؟) نا بار یہ بوجھ میرے بوتے کا نہیں!

باگیشری پر ان دلیلوں کا کوئی اثر نہیں ہوا ۔ بولی ۔ وہ بھی تو کچھ دے گا ۔

" تو کیا میں اس سے مانگنے جاؤنگا ؟ "

" تمہارے مانگنے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی ۔ لڑکی کی شادی میں کوئی پیسے کا منہ نہیں دیکھتا ۔ پھر دین دیال کے یہی ایک لڑکی ہے ۔ بچا کر رکھیں گے تو بھی کس لئے ؟ "

دیا ناتھ کو اب کوئی بات نہ سوجھی ۔ صرف اتنا بولے ۔ " وہ چاہے لاکھ دے دیں اور چاہے ایک نہ دیں ۔ میں نہ کہوں گا کہ دو ورنہ کہوں گا کہ مت دو ۔ قرض میں لینا نہیں چاہتا اور لوں تو دوں کس کے گھر سے ۔ "

باگیشری نے اس مشکل کو یوں آسان کیا ۔ " مجھے تو یقین ہے کہ وہ ٹیکے میں ایک

ہزار سے کم نہ دینگے۔ نمائش کے لئے اتنا بہت ہے۔ گہنوں کا انتظام کسی صرّاف سے کر لینا۔ دروازے پر بھی تو کچھ ملے گا ہی، وہ صرّاف کو دے دینا۔ دو چار سو رہ جائیں گے تھوڑا تھوڑا کرکے وہ بھی چکا دینا۔ پھر بچے کے لئے بھی تو کوئی نہ کوئی دروازہ کھلے گا۔"

دیاناتھ نے بے رُخی سے کہا، "وہ کمل چکا جسے شطرنج اور سیر سپاٹے سے فرصت نہ ملے اس کے لئے سبھی دروازے بند رہیں گے۔"

باگیشری کو اپنی شادی کے حالات یاد آئے۔ اس وقت دیاناتھ بھی تو گل چھرّے اڑاتے تھے۔ لیکن اس کے گھر میں آتے ہی انہیں چار پیسے کمانے کی فکر کیسی سر پر سوار ہو گئی تھی۔؟ سال بھر کے اندر ہی پندرہ روپے کی جگہ پا گئے۔ بولی، "بہو کو آنے دو۔ یہ سیر سپاٹے بھول جائیں گے۔ دیکھو اپنی ہی بات یاد کرو۔ جب تک گلے میں جوا نہیں پڑتا سبھی کو کلیلیں سوجھتی ہیں۔ جوا پڑا اور سارا نشہ ہرن ہوا۔ نکموں کو راہ پر لانے کی اس سے بڑھ کر دوسری ترکیب ہی نہیں۔"

دیاناتھ اخبار پڑھنے لگے۔ جب وہ ہار جاتے تھے تو اخبار پڑھنے لگتے تھے۔ اپنی شکست کو چھپانے کا ان کے پاس یہی ایک ذریعہ تھا۔

(۴)

منشی دینڈیال ان آدمیوں میں سے تھے جو سیدھوں کے ساتھ سیدھے ہوتے ہیں، مگر ٹیڑھوں کے ساتھ ٹیڑھے ہی نہیں، شیطان ہو جاتے ہیں۔ دیاناتھ نے بے پر کی اڑائی ہوتی تو دین دیال انہیں ایسا چکمہ دیتے کہ وہ عمر بھر یاد رکھتے۔ دیاناتھ کی شرافت نے انہیں فریفتہ کر لیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ ایک ہزار میں شادی کی ساری رسمیں پوری کر دیں۔ مگر ایک ہزار ٹیکے ہی میں دے آئے۔

دیاناتھ ایک ہزار کی تھیلی پا کر خوش تو ہوئے مگر اس نے اُن کے سر کا بوجھ ہلکا

کرنے کے بدلے اور بھاری کر دیا۔ شادی کی تیاریاں بھی اب وسیع پیمانے پر کرنی پڑیں گی۔ اس شادی میں انہوں نے کم سے کم خرچ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن دین دیال کی فیاضی نے انہیں بھی فیاض بننے پر مجبور کر دیا۔ وہ سارے ٹھم ٹھام۔ ناچ تماشے جنہیں وہ لغو سمجھتے تھے اب فرض کی صورت میں ان کے ورد آ کھڑے ہوئے۔ بندھا ہوا گھوڑا تھان سے کھل گیا۔ کون روک سکتا ہے۔ پہلے چڑھاوے کو انہوں نے محض رسم سمجھا تھا۔ اب ایسا چڑھاوا لے جانے کی تجویز ہوئی جسے دیکھ کر سب کی آنکھیں کھل جائیں۔ کوئی تین ہزار کا سامان بنوا ڈالا صراف کو ایک ہزار نقد مل گیا۔ ایک ہزار کے لئے ایک ہفتے کا وعدہ ہوا۔ تو اس نے کوئی عذر نہ کیا۔ بیوپاری کی لاگت نکل آتی ہے تو نفع کے متعلق اسے زیادہ اندیشہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی چندن ہار کی کسر رہ گئی۔ جڑاؤ چندن ہار ایک ہزار سے کم میں اچھا نہیں مل سکتا تھا۔ دیا ناتھ کا جی تو ہرایا کہ لگے ہاتھ اسے بھی لے لو۔ مگر باگیشری اس پر راضی نہ ہوئی۔ بازی پلٹ چلی تھی۔

دیا ناتھ نے گرم ہو کر کہا۔ "تمہیں کیا تم گھر میں بیٹھی رہو گی۔ ندامت تو مجھے ہوگی۔ جب ادھر والے مین دیکھ نکالنے لگیں گے"

"دو گے کہاں سے کچھ سوچا ہے۔"

کم از کم ایک ہزار تو وہاں تشتے مل جائیں گے۔

"خون منہ لگ گیا شاید؟"

دیا ناتھ نے شرما کر کہا۔ "نہیں نہیں۔ مگر آخر وہاں بھی تو کچھ ملے گا۔"

باگیشری بولی۔ "وہاں ملے گا تو وہاں خرچ بھی ہوگا۔ نام چڑھاوے سے نہیں ہوتا دان دکشنا سے ہوتا ہے۔"

اس طرح چندن ہار کی تجویز فسخ ہوگئی۔

مگر دیا ناتھ نمائش کو کتنا ہی غیر ضروری سمجھیں۔ رما ناتھ اور اس کے احباب اسے

معدوم سمجھتے تھے۔ برات ایسی دھوم دھام سے جانی چاہیئے کہ سارے علاقے میں دھوم مچ جائے۔ پہلے نوشہ کے لئے پالکی کی تجویز ہوئی تھی۔ رما ناتھ اور اس کے دوستوں نے موٹر پہ زور دیا۔ دیا ناتھ تنہائی پسند آدمی تھے۔ نہ کسی سے دوستی تھی اور نہ ربط وضبط۔ رما ناتھ ملنسار تھا اس کے احباب بھی اس وقت ساری تیاریوں میں پیش پیش تھے۔ وہ جو کام کرتے دل کھول کر۔ آتشبازیاں بنوائیں تو اوّل درجے کی۔ طائفہ کیا تو اوّل درجہ کا۔ باجے لگا جسے بھی اول درجے کے۔ دوم سوم کا وہاں ذکر ہی نہ تھا۔ دیا ناتھ ان کی فضول خرچی دیکھ کر فکر مند ہو جاتے تھے۔ مگر کرتے کیا؟

(۵)

ناٹک اس وقت پاس ہوتا ہے۔ جب اہل ذوق اسے پسند کر لیتے ہیں۔ برات کا ناٹک اس وقت پاس ہوتا ہے جب ہر خاص و عام اسے پسند کر لیتا ہے۔ ناٹک کا امتحان چار پانچ گھنٹے ہوتا رہتا ہے۔ برات کے امتحان کے لئے صرف اتنے منٹوں کا موقعہ ہوتا ہے۔ ساری دوا دوش کاوش و جانفشانی کا فیصلہ پانچ منٹوں میں ہو جاتا ہے۔ اگر ہر ایک کے منہ سے واہ واہ نکل گئی تو تماشہ پاس۔ نہیں تو فیل۔ قسمتی دیا ناتھ کا تماشہ پاس ہو گیا۔ تیسرا درجہ ملتا۔ مگر اُن میں اوّل درجہ مل گیا۔ کوئی باجوں کی دھوں دھوں پوں پوں سنکر مست ہو رہا تھا۔ تو کوئی موٹروں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ لیکن کچھ لوگ پھلواریوں کے تختے دیکھ کر لوٹے جاتے تھے۔ اور آتشبازی تو دلچسپی کا خاص مرکز تھی۔ ہوائیاں جب سن سے اُوپر جاتیں اور آسمان میں سرخ سبز، زرد، نیلے قمقمے سے بکھر جاتے۔ جب چرخیاں چھوٹتیں اور ان میں سے ناچتے ہوئے مور نکل آتے تو لوگوں پر جادو کا اثر ہوتا تھا۔

جالپا کے لئے ان نمائشوں میں ذرا بھی کشش نہ تھی۔ ہاں وہ نوشہ کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ سب سے چھپکر۔ مگر اس بھیڑ بھاڑ میں یہ موقعہ کہاں؟ دروازہ چار کے وقت

اس کی سہیلیاں اسے چھت پر نیچے لے گئیں۔ مگر وہاں بھی وہ رمانا تھ کا صرف سہرا دیکھ سکی۔ چہرہ نظر نہ آیا۔

دروازہ چار کے بعد کھانے پینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ تھوڑے سے آدمیوں نے پوریاں کھائیں۔ زیادہ آدمیوں نے اپلوں پر باٹیاں پکائیں۔ چاروں طرف دھواں ہی دھواں نظر آنے لگا۔ تماشائیوں کی تفریح کے لئے محفل آراستہ ہوئی۔

آدھی رات کو پھر یکایک باجے بجنے لگے۔ معلوم ہوا کہ چڑھاوا آرہا ہے۔ شادی کی ہر ایک رسم ڈنکے کی چوٹ ادا ہوتی ہے۔ نوشہ کرنے آرہا ہے۔ باجے بجنے لگے۔ میری ملنے آرہا ہے۔ باجے بجنے لگے۔ خیر چڑھاوا جونہی پہنچا، گھر میں ہل چل مچ گئی۔ مرد، بوڑھے جوان چھوٹے بڑے سب چڑھاوا دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ آپس میں دھکم دھکا ہونے لگا۔ مانکی پیاس سے بے حال ہو رہی تھی، حلق سوکھا جاتا تھا۔ چڑھاوا آتے ہی اس کی پیاس بھاگ گئی۔ دیندیال ایک کوٹھری میں نیم جان سے پڑے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی بے تحاشا دوڑے، مانکی مانکی ایک ایک چیز کو نکال کر دیکھنے اور دکھانے لگی۔ وہاں سب ہی اس فن کے ماہر تھے۔ مردوں نے گہنے بنوائے تھے۔ عورتوں نے پہنے تھے۔ سبھی تبصرے کرنے لگے۔ یہ چوبے دنتی کتنی خوبصورت ہے۔ کوئی دس توے کی ہوگی۔ یہ شیروان تو دیکھو۔ کیا ہاتھ کی صفائی ہے۔ کوئی بارہ توے کا ہوگا۔ واہ کبھی دیکھا بھی ہے! سولہ توتے سے کم نکل جائے تو منہ نہ دکھاؤں۔ ہاں مال اتنا چوکھا نہیں ہے۔ یہ کنگن تو دیکھو۔ کچی جڑائی ہے۔ کتنا باریک کام ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی سچے نگینے ہیں۔ اصلی چیز تو یہ گلوبند ہے۔ کتنے خوبصورت پھول ہیں! اور ان کے بیچ کے ہیرے کیسے چمک رہے ہیں۔ بنگالی سنار نے بنایا ہوگا۔ کیا بنگالیوں نے کاریگری کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ ہمارے یہاں ایک سے ایک کاریگر پڑے ہوئے ہیں۔ بنگالی سنار بیچارے کیا ان کی برابری کریں گے۔

اسی طرح ہر ایک چیز کی تنقید ہوتی رہی۔ دفعتاً کسی نے کہا۔ کیا چندن ہار

نہیں ہے۔؟

مالکی نے رونی صورت بنا کر کہا۔ نہیں۔ چندن ہار تو نہیں آیا۔

ایک بوڑھی عورت نے حیرت کا اظہار کیا۔ ارے چندن ہار نہیں آیا۔

دیدیال نے اپنی خفت کو چھپاتے ہوئے کہا۔ اور سب چیزیں تو ہیں ایک چندن ہار ہی تو نہیں ہے۔

بوڑھی عورت نے منہ بنا کر کہا۔ "چندن ہار کی بات اور ہی ہے۔"

مالکی نے چڑھاؤ کو سامنے سے ہٹا کر رکھا۔ بیچاری کی تقدیر میں چندن ہار لکھا ہی نہیں ہے۔

تماشائیوں کے اس جتھے کے پیچھے جا لیا اُمید دیم کی تصویر سی بنی کھڑی تھی اور سب زیوروں کے نام کان میں آتے تھے۔ چندن ہار کا نام نہ آتا تھا۔ اس کا سینہ دھک دھک کر رہا تھا۔ چندن ہار شاید سب زیوروں کے نیچے ہو۔ ممکن ہے کسی کی نگاہ نہ پڑی ہو۔ یا پیچھے سے کسی اور رسم میں ملے۔ اس طرح وہ دل کو سمجھاتی رہی۔ جب یقین ہو گیا کہ چندن ہار نہیں ہے تو اس کے جگر پر چوٹ سی لگی۔ معلوم ہوا جسم میں ایک قطرہ بھی خون نہیں ہے، وہ ایک بے خودی کی حالت میں اپنے کمرہ میں آئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ تمنا جو سات برس پہلے اُس کے دل میں اُگی تھی جو اس وقت پھول اور پتوں سے لدی کھڑی تھی۔ اس پر بجلی گر پڑی۔ اس مایوسی کے عالم میں اُسے ایسا غصہ آ رہا تھا کہ چڑھاوے کو اُٹھا کر پھینک دے۔ کمرے میں ایک طاق پر شیو کی مورت رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اُسے اُٹھا کر اتنے زور سے پٹکا کہ اس کی تمنا ہی کی طرح وہ بھی چُور چُور ہو گئی۔ اس نے دل میں عہد کیا۔ اب کوئی زیور نہ پہنوں گی۔ زیور پہننے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ مفت کی زحمت! جانے کہاں سے کوڑا کرکٹ اٹھا لائے۔ جس چیز میں روپے خرچ ہونے تھے اس کا نام ہی نہ لیا۔

وہ غصّہ میں بھری بیٹھی تھی کہ اس کی تین سہیلیاں آ کر کھڑی ہو گئیں۔ جالپا نے انہیں دیکھتے ہی آنکھیں نیچی ڈالیں اور مسکرانے لگی۔

رادھا بولی۔ بہن تم نے بڑی تپسیا کی تھی۔ ایسا چڑھاوا میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اب تو تیرا کوئی ارمان باقی نہیں رہا۔

جالپا نے بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف ایسی بیکسانہ نگاہوں سے دیکھا۔ گویا زندگی میں اب اس کے لئے کوئی امید نہیں ہے۔ ہاں بہن سارے ارمان پورے ہو گئے۔

تینوں سہیلیاں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگیں۔ گویا اس جملے کا مطلب ان کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔

بسنتی نے کہا۔ تمہاری ساس بڑی عقلمند معلوم ہوتی ہے۔ کوئی چیز نہیں چھوڑی الیا جی چاہتا ہے کہ کاریگر کے ہاتھ چوم لوں۔

رادھا۔ اور تو سب کچھ ہے، صرف چندن ہار نہیں ہے۔

شہزادی۔ ایک چندن ہار کے نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کے عوض گلوبند تو ہے۔

جالپا نے طنز سے کہا۔ ہاں! آنکھ نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے، جسم میں اور سب اعضاء تو ہوتے ہی ہیں۔ آنکھیں ہوئیں تو کیا، نہ ہوئیں تو کیا۔

بچوں کے منہ سے دانشمندی کی باتیں سن کر جیسے تمہیں ہنسی آجاتی ہے۔ اسی طرح جالپا کے منہ سے یہ مایوسانہ الفاظ سُن کر رادھا اور بسنتی اپنے تئیں نہ روک سکیں۔ ہاں شہزادی کو ہنسی نہ آئی۔ ایسی زیور کی ہوس اس کے نزدیک ہنسنے کی بات نہیں رونے کی بات تھی۔ مصنوعی ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے بولی وہ سب کے سب نہ جانے کہاں کے دہقان ہیں کہ سب چیزیں تو لائے لیکن چندن ہار نہ لائے جو سب گہنوں کا راجہ ہے۔ ابھی نوشہ صاحب آتے ہیں تو پوچھتی ہوں۔ تم نے یہ کہاں سے ریت نکالی ہے۔ کوئی ایسا ظلم بھی

کرتا ہے؟

رادھا اور بسنتی سہم رہی تھیں کہ جالپا کہیں تاڑ نہ جائے۔ ان کا بس ہوتا تو شہزادی کا منہ بند کر دیتیں، مگر جالپا کو شہزادی کے تصنع میں خلوص کا رنگ نظر آ رہا تھا۔ آبدیدہ ہو کر بولی ان سے پوچھ کر کیا کرو گی۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔

شہزادی۔ تم پوچھنے کو کہتی ہو۔ میں رو لا کر چھوڑوں گی۔ میرے چڑھاؤ میں کنگن نہ آئے تھے۔ اس وقت طبیعت ایسی کھٹی ہوئی کہ سارے زیوروں پر لات مار دوں۔ جب تک کنگن نہ بن گئے میں نیند بھر سوئی نہیں۔

رادھا۔ تو کیا تم سمجھتی ہو، چندن ہار ملے گا ہی نہیں۔

شہزادی ملے گا جب ملے گا۔ اس موقعہ پر تو نہیں ملا۔ دس پانچ کی چیز تو ہے نہیں کہ جب چاہا بنوا لیا۔ سینکڑوں کا خرچ ہے۔ پھر کاریگر بھی تو ہمیشہ نہیں ملتے۔

جالپا۔ یہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں۔ جب آج نہ ملا تو پھر کیا ملے گا۔

رادھا اور بسنتی دونوں شہزادی کو دل میں کوس رہی تھیں۔ اور تھپڑ دکھا رہی تھیں مگر شہزادی کو اس وقت تماشے کا مزا آ رہا تھا۔ بولی نہیں یہ بات نہیں ہے۔ بہن! ضد کرنے سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ ساس سسر کو بار بار یاد دلاتی رہنا۔ دولہا صاحب سے بھی دو چار دن روٹھ کر بیٹھنے سے کچھ کام نکل سکتا ہے۔ بس یہی سمجھ لو کہ گھر والے چین نہ لینے پائیں۔ انہیں یقین ہو جائے کہ بغیر چندن ہار بنوائے خیریت نہیں۔ تم ذرا بھی نرم پڑیں اور کام بگڑا۔

رادھا نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ ان سے نہ بنے تو تمہیں بلا لیں۔ کیوں؟ اب اٹھو گی یا ساری رات سبق ہی دیتی رہو گی۔

شہزادی۔ چلتی ہوں۔ ایسی کیا بھاگڑ پڑ رہی ہے۔ ہاں! خوب یاد آئی۔ کیوں بہن! تیری اماں جی کے پاس تو بڑا اچھا چندن ہار ہے۔ تجھے نہ دے گی۔

جالپا نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ مجھے تو اس سے کوئی اُمید نہیں ہے بہن!

شہزادی۔ ایک بار کہہ کر دیکھ لو۔ اب کون ان کے پہننے اوڑھنے کے دن ہیں۔

جالپا۔ مجھ سے تو کہا نہ جائے گا۔

شہزادی۔ میں کہہ دوں گی۔

جالپا۔ نہیں۔ تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں ذرا ان کی ماتا کا امتحان لینا چاہتی ہوں۔

بسنتی نے شہزادی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے تو ساری رات کا ہیرا لے کر آئی ہے۔ چل مجھے پہنچا کر لوٹ آنا۔

شہزادی اُٹھی۔ مگر جالپا نے راستہ روک لیا۔ اور بولی۔ نہیں ابھی بیٹھو بہن! تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔

شہزادی۔ جب یہ دونوں چڑیلیں بیٹھنے بھی دیں۔ میں تو تمہیں گُر سکھاتی ہوں اور یہ دونوں جھلاتی ہیں۔

بسنتی۔ تو بِش کی گانٹھ ہے۔

شہزادی۔ تم بھی تو سُسرال سے سال بھر بعد آئی ہو۔ کون کون سی نئی چیزیں بنوا کر لائیں؟

بسنتی۔ اور تم نے تین سال میں کیا بنوا لیا۔

شہزادی۔ میری بات چھوڑو۔ میرا خصم تو میری بات ہی نہیں پوچھتا۔

رادھا۔ محبت کے سامنے زیوروں کی کوئی حقیقت نہیں۔

شہزادی۔ تو وہ سوکھی محبت تمہیں مبارک رہے۔

اتنے میں مانکی نے آن کر کہا۔ تم تینوں یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ چلو وہاں لوگ کھانا کھانے آ رہے ہیں۔ تینوں سہیلیاں چلی گئیں۔ جالپا ماں کے گلے میں چندن ہار کی رونق دیکھ

سوچنے لگی۔ ان زیوروں سے ان کی طبیعت اب تک سیر نہیں ہوئی۔

(۶)

بابو دیاناتھ جتنے حوصلے سے شادی کرنے گئے تھے۔ اتنے ہی خاطر شکستہ ہو کر لوٹے دینڈیال کی فیاضی میں شبہ نہیں۔ لیکن وہاں سے جو کچھ ملا، وہ سب وہیں خرچ ہو گیا۔ بار بار اپنی غلطی پر پچھتاتے۔ کیوں نمود نمائش میں اتنے روپئے خرچ کر دیئے۔ زیادہ سے زیادہ لوگ یہی کہتے کہ یہ حضرت بڑے بخیل ہیں۔ اتنا سُن لینے میں کیا نقصان تھا اور سبھی تقاضے تو پانچ دس دن میں ٹل سکتے تھے۔ مگر صراف کسی طرح نہ مانتا تھا۔ اس سے شادی کے ساتویں دن ایک ہزار روپے دینے کا وعدہ تھا۔ ساتویں دن صراف آ گیا۔ مگر یہاں روپے کہاں تھے۔ دیاناتھ میں للّو چپو کی عادت نہ تھی۔ مگر ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ انہوں نے اسے چکمہ دینے کی خوب کوشش کی۔ چھ مہینے میں باقساط زر بیر ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ پھر تین مہینے پر آئے مگر صراف بھی ایک گھٹا ہوا۔ اسی وقت ٹلا۔ جب دیاناتھ نے تیسرے دن باقی رقم کے زیور واپس کر دینے کا وعدہ کیا۔ آخر وہ تیسرا دن بھی آ گیا اور اب دیاناتھ کو اپنی لاج رکھنے کی کوئی ترکیب نہ سوجھتی تھی۔ کوئی چلتا ہوا آدمی شاید اتنا پریشان نہ ہوتا۔ حیلے حوالے کر کے مہاجن کو مہینوں ٹالتا رہا۔ لیکن دیاناتھ اس معاملہ میں اناڑی تھے۔

بالگیشری نے آ کر کہا۔ کھانا کب سے پکا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کھا کیوں نہیں لیتے۔

دیاناتھ نے اس طرح گردن اٹھائی۔ گویا سر پر سینکڑوں من کا بوجھ لدا ہوا ہے اور بولے تم جا کر کھا لو۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔

بالگیشری۔ بھوک کیوں نہیں ہے۔ رات بھی تو کچھ نہیں کھایا تھا۔ یوں دانہ پانی چھوڑ دینے سے مہاجن کے روپے تھوڑے ہی ادا ہو جائیں گے۔

دیاناتھ۔ یہی سوچتا ہوں۔ اسے آج کیا جواب دونگا۔ میں تو یہ شادی کر کے بُرا پھنسا۔

بہو کچھ زیور لوٹا تو دے گی۔

باگیشری۔ بہو کا حال تو سن چکے۔ پھر بھی اس سے ایسی اُمید رکھتے ہو۔ اس کی ٹیک ہے کہ جب تک چندن ہار نہ بن جائے گا کوئی گہنہ نہ پہنوں گی۔ ساری چیزیں صندوق میں بند کر رکھی ہیں۔ بس ایک وہی بلوریں ہار گلے میں ڈالے ہوئے ہے۔ بہوئیں بہت دیکھی ہیں مگر ایسی بہو نہ دیکھی تھی۔ پھر کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے کہ کل کی آئی بہو اس سے گہنے مانگ لئے جائیں۔

دیانا تھ نے چڑ کر کہا۔ تم تو جلے پر نمک چھڑکتی ہو۔ بُرا معلوم ہوتا ہے تو لاؤ روپے نکال کر دے دو۔ دیتی ہو۔ بُرا مجھے خود معلوم ہوتا ہے۔ مگر تدبیر کیا ہے۔ گلا کیسے چھوٹے۔

باگیشری۔ بیٹے کا بیاہ کیا ہے یا مذاق ہے۔ شادی بیاہ میں سبھی قرض لیتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پارسا بننے کا کچھ سبق ملنا چاہیئے یا نہیں۔ تمہارے ہی دوست لالہ سبتہ دیو ہیں۔ پکا مکان کھڑا کر لیا۔ زمینداری خریدی۔ بیٹی کی شادی میں کچھ نہیں تو پانچ ہزار تو خرچ کئے ہوں گے اور تم اپنی پارسائی لئے پھرتے ہو۔

دیانا تھ۔ جبھی دونوں لڑکے بھی تو چل دیئے۔

باگیشری۔ مرنا جینا تو دنیا کا طریق ہے۔ جو لیتے ہیں وہ بھی مرتے ہیں جو نہیں لیتے وہ بھی مرتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو چھ مہینے میں سب روپے چکا سکتے ہو۔

دیانا تھ نے تیوری بڑھا کر کہا۔ جو بات زندگی بھر نہیں کی۔ وہ اب آخری وقت نہیں کر سکتا۔ بہو سے گھر کا حال صاف صاف کہہ دو۔ اس سے پردہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اور پردہ رہ ہی کتنے دن سکتا ہے۔ بس تین چار چیزیں لوٹا دے۔ تم اسے ایک بار کہو تو۔

باگیشری جھنجلا کر بولی۔ اس سے تمہیں کہو۔ مجھ سے نہ کہا جائے گا۔

اسی وقت رما نا تھ ٹینس ریکٹ لئے باہر سے آیا۔ جسم پر سفید ٹینس شرٹ تھا۔ سفید پتلون۔ کینوس کا جوتا۔ خوش رو آدمی تھا۔ اس لباس سے رئیس زادوں کی شان

پیدا کر دی تھی۔ رومال میں بیلے کے گجرے لئے ہوئے تھا۔ اس سے خوشبو اڑ رہی تھی۔ ماں باپ کی آنکھیں بچا کر زینہ پر جانا چاہتا تھا کہ باگیشری نے ٹوکا۔ کہاں جاتے ہو۔ تم نے ناچ تماشے میں بارہ تیرہ سو روپے اڑا دیئے۔ بتلاؤ صراف کو کیا جواب دیا جائے۔

رمانا تھ نے اس الزام کو تردید کرتے ہوئے کہا۔ میں نے روپے اڑا دیئے۔ میں نے بابوجی کے حکم بغیر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔

حقیقت بھی یہی تھی۔ اگر دیانا تھ کی مرضی نہ ہوتی۔ تو رما کیا کر سکتا تھا۔ جو کچھ ہوا۔ ان کی رضامندی سے ہوا۔

دیانا تھ نے اس قول کی تائید کی۔ میں تمہیں الزام نہیں دیتا بھائی۔ کیا تو میں نے ہی مگر یہ بلا تو کسی طرح سر سے ٹالنی چاہیئے۔ صراف کا تقاضا ہے۔ میرے سمجھ میں یہی ایک تدبیر ہے کہ باقی روپیوں کے زیور واپس کر دئے جائیں۔ تمہاری کیا صلاح ہے۔

رما نے شرماتے ہوئے کہا۔ میں اس معاملہ میں کیا صلاح دے سکتا ہوں۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس تجویز کو وہ خوشی سے منظور نہ کرے گی۔

باگیشر نے خوش ہو کر کہا۔ یہی تو میں ان سے کہہ رہی ہوں۔

رما۔ رونا دھونا شروع ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی گھر کا پردہ بھی کھل جائے گا۔

دیانا تھ نے آزردہ خاطر ہو کر کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس سے پردہ رکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ اپنی اصلی حالت کا اسے جتنی جلدی علم ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

رمانا تھ نے عام نوجوانوں کی طرح جا لپا سے خوب زیٹ اڑائی تھی۔ خوب بڑھ بڑھ کر باتیں بنائی تھیں۔ زمینداری ہے۔ اس سے کئی ہزار کا نفع ہے۔ بینک میں روپے ہیں سود آتا ہے۔ بولا۔ آپ کا فرمانا درست ہے۔ پر اتنی جلدی بھرم کھل جانے کا نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ ہمیں ذلیل سمجھنے لگے گی۔

دیا ناتھ۔ ہم نے دینیال سے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ ہم لکھ پتی ہیں۔

رما۔ تو آپ نے یہی کب کہا تھا کہ جاکر پرزیور لائیں گے اور دو چار دن میں لوٹا دیں گے۔ آخر یہ سارا سوانگ اپنی دھاک بٹھانے کے لئے ہی تو کیا تھا یا کچھ اور۔

نہ دیا تو پھر کچھ دوسرا بہانہ کرنا پڑے گا۔ دوسری کوئی تدبیر نہیں۔ کل یا تو روپے دینے پڑیں گے یا زیور واپس کرنے پڑیں گے۔

باگیشری۔ اور کونسا بہانہ کیا جائے گا۔ اگر کہا جائے کسی کو مانگے دینا ہے۔ تو شاید وہ دے ہی نہیں۔ دیا ناتھ کو ایک حکمت سوجھی۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ان زیوروں کے بدلے ملمع کی چیزیں دے دی جائیں۔ مگر فوراً ہی خیال آگیا کہ یہ بچربات ہے۔ خود ہی اس کی تردید کی اور بولے۔ کیوں نہ ساری حالت اسے سمجھا دی جائے۔ ذرا کے لئے اسے رنج تو ہوگا۔ لیکن ہمیشہ کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا۔

لیکن اس میں رما ناتھ کی کوکری ہوتی تھی۔ پھر تو اسے منہ دکھانے کی بھی جگہ نہ رہے گی۔ جب وہ پوچھے گی۔ تمہاری زمینداری کیا ہوئی۔ بینک کے روپے کیا ہوئے۔ تو وہ کیا جواب دے گا؟ رنجیدہ ہو کر بولا۔ اس میں سراسر بے عزتی ہے۔ کیا آپ صرف کو دو چار مہینے بھی نہیں ٹال سکتے۔

دیا ناتھ۔ غیر ممکن۔

تینوں کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ دیا نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ چونکہ ماں اور بیٹے کو یہ فیصلہ منظور نہ تھا۔ اس لئے اب اس گتھی کو سلجھانے کا بار بھی انہیں دونوں پر تھا۔ باگیشری نے تو طے کر لیا تھا کہ دیا ناتھ کو تہمک مار کر اپنی پارسائی کو رخصت کرنا پڑے گا۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ ہمارے اوپر بوجھ لدا ہوا ہو اور ہم دھرم کا راگ الاپتے جائیں۔ مگر رما ناتھ جانتا تھا کہ والد نے جو کام اپنی زندگی میں کبھی نہیں کیا وہ آج نہ کریں گے۔ وہ بغیر پس و پیش کے جا کر اسے زیور مانگ بیٹھیں گے اور وہ

یہ نہ چاہتا تھا۔ وہ اب پچھتا رہا تھا کہ کیوں جا لیا سے ڈینگیں ماریں۔ اس وقت اسے ذرا بھی فکر نہ تھی کہ ایک دن سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ دروغ دور اندیش نہیں ہوتا لیکن وہ دن اتنے جلد آئے گا۔ یہ کون جانتا تھا۔ اگر اس نے جھوٹا وقار نہ جمایا ہوتا تو باگیشری کی طرح وہ بھی سارا بار دیا ناتھ پر چھوڑ کر بے فکر ہو جاتا۔ لیکن اس وقت وہ اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں پھنس گیا تھا۔ کیسے نکلے؟

اس نے کتنی ہی تدبیریں سوچیں۔ لیکن ایسی کوئی نہ تھی۔ جو آگے چل کر اُسے اُلجھن میں نہ ڈال دیتی۔ یکایک اسے ایک چال سُوجھ گئی۔ اس کا دل اچھل پڑا۔ لیکن جا لیا کے ساتھ دغا یا فریب کرنے کا خیال بھی اسے ذلت آمیز معلوم ہوا۔

دیا ناتھ نے پوچھا۔ کوئی تدبیر سوجھی۔

"مجھے تو کچھ نہیں سوجھتا۔"

"مگر کوئی تدبیر تو سوچنی ہی پڑے گی۔ کیوں اس سے دو چار عدد مانگ نہیں لیتے۔ یہ تو ایسا مشکل کام نہیں۔"

"مجھے شرم آتی ہے۔"

"تم بھی عجیب آدمی ہو۔ نہ خود مانگو گے نہ مجھے مانگنے دو گے۔ تو آخر یہ ڈیرے گا کیسے پار لگے گا۔ میں تم سے ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا۔ اپنی زندگی کے آخری دن جیل میں نہیں کاٹنا چاہتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ کس کی زندگی میں ایسے موقع نہیں آتے۔ تمہیں اپنی ماں سے پوچھو۔"

باگیشری نے اس کی تائید کی۔ مجھ سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ گھر کے لوگ پریشان ہوں اور میں زیور پہنے بیٹھی رہوں۔ نہیں تو آج میرے پاس گہنے ہوتے۔ شادی میں پانچ ہزار سے کم کا چڑھاوا نہیں گیا تھا۔ مگر پانچ ہی سال میں سب صاف ہو گیا۔

دیا ناتھ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "شرم کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔"

رمانا تھ نے جھینپتے ہوئے کہا "مانگ تو میں بھی نہیں سکتا۔ ہاں! کہیئے اٹھا لاؤں؟"

دیانا تھ نے حیرت میں آکر پوچھا "اٹھا لاؤ گے اس سے چھپا کر؟"

رمانے ترش ہو کر کہا۔ "اور آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟"

دیانا تھ نے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔ اور ایک لمحے کے بعد بولے۔ "نہیں میں نے جال کبھی نہیں کیا اور نہ کبھی کروں گا۔ جال کروں اپنی بہو کے ساتھ۔ چھی، چھی، جو کام آسانی سے ہو سکتا ہے اس کے لئے فریب! کہیں اس کی نگاہ پڑ گئی۔ تو تمہیں دل میں کیا سمجھے گی ـــ مانگ لینا اس سے کہیں بہتر ہے۔"

رمانے کہا۔ "آپ کو اس سے کیا مطلب! مجھ سے چیزیں لے لیجئے گا مگر جب آپ جانتے تھے کہ ایک دن یہ نوبت آئے گی۔ تو اتنے زیور لے جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ مفت کا درد سر مول لیا۔ اُس کھانے سے کیا فائدہ کہ پیٹ میں درد ہونے لگے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ نے کوئی راستہ نکال لیا ہوگا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ زحمت میرے سر تھوپ دیں گے۔ ورنہ میں ان تمام چیزوں کو کبھی نہ لے جانے دیتا۔ یہی تو ہوتا کہ اُدھر والوں کو شکایت ہوتی۔ مگر شکایتوں سے ہمارا کیا نقصان تھا۔ یہ تو گناہ بے لذت ہوا۔ بدنامی الگ ہوئی۔ پریشانی الگ۔ میں یہ نہیں دکھانا چاہتا کہ ہم سب اتنے پھٹے حال ہی ہیں۔ چوری ہو جانے پر تو صبر کرنا ہی پڑے گا۔"

دیانا تھ چپ ہو گئے۔ اس جوش میں رمانے انہیں خوب کھری کھری سنائیں اور وہ چپ چاپ سنتے رہے۔ آخر جب نہ سنا گیا تو اُٹھ کر پھر کتب خانے میں چلے گئے۔ یہ ان کا روز کا دستور تھا۔ جب تک دو چار رسالے نہ پڑھ لیں۔ ان کا کھانا ہضم نہ ہوتا تھا۔ اسی گوشۂ عافیت میں پہنچ کر وہ گھر کی فکروں سے آزاد ہو جاتے تھے۔

آخر رما بھی وہاں سے اٹھا پر جالپا کے پاس نہ جا کر اپنے کمرے میں گیا۔ اس کا

کوئی کمرہ الگ تو تھا نہیں۔ ایک ہی مردانہ کمرہ تھا۔ اسی میں دیا ناتھ اپنے دوستوں سے گپ شپ کرتے۔ دونوں لڑکے پڑھتے اور رما احباب کے ساتھ شطرنج کھیلتا رہا کرے میں پہنچا تو دیکھا۔ دونوں لڑکے تاش کھیل رہے ہیں۔ گوپی کا تیرھواں سال تھا۔ شمبھر کا نواں۔ دونوں رما سے تھر تھر کانپتے تھے۔ رما خود خوب تاش اور شطرنج کھیلتا۔ مگر بھائیوں کو کھیلتے دیکھ کر اس کے ہاتھ میں کھجلی ہونے لگتی تھی۔ خود چاہے دن بھر سیر سپاٹے کیا کرے مگر کیا مجال کہ دونوں بھائیوں میں سے کوئی باہر نکلے۔ دیا ناتھ خود لڑکوں کو کبھی نہ مارتے تھے۔ موقع ملتا تو ان کے ساتھ کھیلتے تھے۔ انہیں کنکوے اڑاتے دیکھ کر ان کی بچپن کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ دو چار پینچ لڑا دیتے۔ اس لئے لڑکے رما سے جتنا ڈرتے تھے اتنا ہی باپ سے محبت کرتے تھے۔

رما کو دیکھتے ہی لڑکوں نے تاش کو ٹاٹ کے نیچے چھپا دیا۔ اور پڑھنے لگے مگر کن انکھیوں سے سر پر پڑنے والی چپت کا انتظار کر رہے تھے۔

رما نے مونڈھے پر بیٹھ کر گوپی ناتھ سے کہا۔ تم نے بھنگ کی دکان دیکھی ہے نہ کڑ بڑ۔

گوپی ناتھ خوش ہو کر بولا۔ ہاں! دیکھی کیوں نہیں۔
جا کر چار پیسے کا معجون لے لو۔ اور آدھ سیر مٹھائی بھی لیتے آنا۔
گوپی روپیہ لے کر بازار چلا گیا۔

(۷)

رات کے دس بج گئے تھے۔ جالپا کھلی چھت پر لیٹی ہوئی تھی۔ جیٹھ کی مدھم چاندنی رات میں سامنے گنبد۔ مینار اور درخت۔ خواب کی تصویروں سے معلوم ہوتے تھے جالپا کی آنکھیں چاند کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں چاند کی